تفسیر اور علم تفسیر

جناب نور محمد غفاری ایم اے

قسط (۲)

الغرض ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تفسیر اور تاویل دونوں ایسے علم ہیں جو قرآنی معارف کی شرح و ایضاح کے لئے ضروری ہے۔ اور دونوں میں اگر فرق ہے تو یہ ہے کہ تفسیر کا لفظ سارے قرآن کی تشریح پر بولا جا سکتا ہے۔ اور تاویل صرف متشابہات کی قبیل سے متعلق آیات کی وضاحت پر یا بعض آیات کے باطنی مفہوم کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر کا نام "تاویل" رکھا ہے۔ مثلاً ابن قتیبہؒ متوفی ۲۷۶ھ کی "تاویل مشکل القرآن" اور ابو منصور ماتریدیؒ متوفی ۳۳۳ھ کی "تاویلات قرآن" وغیرہ۔ تو اس کا جواب نہایت سہل ہے کہ "تاویل" کا لفظ غالباً تیسری چوتھی صدی ہجری تک تشریح قرآن کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ کیونکہ اس مدت تک عربی زبان کا غلبہ رہا۔ اور ویسے بھی تبع تابعینؒ کا زمانہ نہایت قریب ہی گزرا تھا۔ لہٰذا تقریباً تمام امت مسلمہ قرآنی الفاظ اور عبارت کا مفہوم بآسانی سمجھ لیتی تھی۔ لہٰذا مفسرین حضرات صرف مشکل القرآن اور غریب الفاظ یا متشابہات کی تفسیر پر زور دیا کرتے تھے۔ اور یہ وہ آیات اور الفاظ تھے جن میں ظاہری مفہوم کی بجائے باطنی مفہوم بتانا مقصود تھا۔ لہٰذا مفسرین حضرات نے اپنی تشریحات کو "تاویل یا تاویلات" کا نام دیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت

تفسیر کی ضرورت اور اہمیت ثابت کرنے کے لئے جو دلائل دیئے جائیں گے، انہیں ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ نقلی دلائل ۲۔ عقلی دلائل

۱۔ نقلی دلائل | انہیں ہم آگے مندرجہ ذیل حصوں میں بانٹ لیتے ہیں۔

ا۔ تفسیر کی ضرورت اور تاکید قرآن حکیم کی روشنی میں۔

ب۔ تفسیر کی اہمیت و فضیلت حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں

ج۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

د۔ تعامل علماء امت کی روشنی میں۔

ا۔ قرآن مجید کی روشنی میں :۔۔۔ کتاب اللہ کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قرآن کی تشریح و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ذمہ داریوں میں سے ایک تھی۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہارگانہ فرائض نبوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۔

(آل عمران : ۱۶۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر بہت بڑا احسان کیا۔ کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو خدا کی آیات سناتا ہے ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے۔ اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان فرائض میں ایک "يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" اب تعلیم نام صرف الفاظ کے پڑھ دینے کا نہیں۔ بلکہ تشریح اور تفسیر کا ہے ـــــ دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔

(نحل : ۴۴)

ہم نے (اے رسول صلی اللہ علیہ وسلم) آپ پر قرآن نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اس بات کی وضاحت کریں جو انکی طرف نازل کی گئی ہے۔

یہ "تبیین کلام" تشریح و توضیح کا ہی دوسرا نام ہے ـــــ ایک اور مقام پر فرمایا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔

(نساء : ۱۰۵)

ہم نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان خدا کی رہنمائی میں فیصلہ کریں۔

حاصل کلام : قرآن مجید نے بتایا کہ کتاب اللہ کی تفسیر ضروری ہے۔

ب :۔ حدیث شریف کی روشنی میں ـــــ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی تفسیر

اپنے قول و فعل دونوں سے فرما کر دکھائی اور امت کو تفسیر کا حکم بھی دیا۔ اور فضیلت بتا کر ترغیب بھی دلائی۔ مثلاً

۱۔ سورہ "حدید" اور اسکی تفسیر سیکھو۔ (بحوالہ الاتقان نوع ۷۸)

۲۔ حضرت ضحاکؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قولہ تعالیٰ: "یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ" سے قرآن کا عطا کرنا مراد ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: "قرآن کا عطا کرنا سے قرآن کی تفسیر مراد ہے۔ کیونکہ پڑھنے کو تو نیک و بد سبھی پڑھتے ہیں۔"

۳۔ بیہقی وغیرہ نے سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ "قرآن مجید کی تعریب (تفسیر) کرو۔ اور اس کے غریب اور نامانوس الفاظ کی تلاش میں سرگرم رہو۔"

۴۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حق میں دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاْوِیْلَ۔ اے اللہ! اسے دین کی فقاہت بخش اور تاویل کا علم عطا فرما۔

تفسیر گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک سنت کی پیروی کرنا ہے۔

ج:۔ تعامل صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین:۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پھر صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے مختلف مقامات پر باقاعدہ حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ مثلاً مدینہ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ اور ان کے شاگردؒ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ان کے تلامذہ راشدہؒ اور کوفہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کلام اللہ مجید کی تفسیر و تشریح کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ اور انہوں نے اپنے شاگردوں کو تفسیر کرنے کا حکم اور ترغیب دی مثلاً:

۱۔ حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا "جو شخص قرآن شریف پڑھتا ہے۔ اور اس کی تفسیر اچھی طرح نہیں کر سکتا اس کی مثال اس اعرابی کی ہے۔ جو شعر کو بے سوچے سمجھے اور غیر موزوں پڑھتا ہے۔ (فضائل القرآن لابوذر الھروی)

۲۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "بیشک مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں قرآن کی کسی ایک آیت کی تعریب (تفسیر و توضیح) کروں۔ بہ نسبت اس بات کے کہ میں ایک آیت حفظ کر لوں۔" (عن الانباری)

اگر کاوش سے کام لیا جائے تو اور بہت اقوال ان حضراتؓ کے مل سکتے ہیں۔

د۔ تعامل علماء امت : صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعینؒ اور ان کے بعد پھر ہر دور میں تفسیر کا عمل برابر جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ علماء نے اپنے عمل اور تحریر دونوں سے یہ بات ثابت کر دی کہ تفسیر کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور اس کے بغیر قرآن کا فہم ممکن نہیں۔ اسی لئے علماء نے تفسیر کرنے کو واجب علی الکفایہ کا درجہ دیا ہے۔

علماء نے بڑی بڑی تفاسیر تصنیف کی ہیں۔ مثلاً امام رازیؒ کی "مفاتیح الغیب"، تفسیر طبری، تفسیر "حدائق ذات البہجہ" وغیرہ ان میں سے "تفسیر صدائق ذات البہجہ" کے پانچ سو (۵۰۰) اجزاء ہیں۔

۲۔ عقلی دلائل | ا۔ حضرۃ امام ابن تیمیہؒ کی دلیل :— فرماتے ہیں : "اس بات کی تشریح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو ایسی زبان سے مخاطب کیا ہے جس کو وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور اسی لئے پروردگار عالم نے ہر ایک رسولؑ کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا ہے۔ اور اپنی کتاب کو بھی اپنی قوموں کی زبان میں نازل فرمایا ہے۔ پھر رہی یہ بات کہ اب تفسیر کی حاجت کیوں رہی؟ تو اس کا جواب ایک قاعدہ کی قرار داد کے بعد دیا جائے گا۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو شخص کتاب تصنیف کرتا ہے، وہ صرف خود ہی سمجھنے کے لئے تصنیف کرتا ہے۔ اور اس کی کوئی شرح نہیں کرتا۔ لیکن اس کتاب کی شرح کی حاجت تین وجوہ سے پڑتی ہے۔

اوّل :۔ ان میں سے پہلی بات مصنّف کی فضیلت کا کمال ہے کہ وہ علمی قوت کی وجہ سے وجیز لفظوں میں دقیق معنی کو جمع کر دیتا ہے۔ اس لئے بعض اوقات مصنّف کی مراد کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں شرح سے ان مخفی معنوں کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے جو اپنی تصانیف کی شروح خود ہی لکھی ہیں، وہ بہ نسبت ان شروح کے جو دوسرے لوگوں نے لکھی ہیں، بہت زیادہ مراد پر دلالت کرنے والی ہیں۔

دوم :۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنّف اپنی کتاب میں چند مسائل کی وضاحت کے لئے کچھ مزید باتیں اور شرطیں اس خیال سے نظر انداز کر دیتا ہے کہ وہ امور اور شروط واضح چیزیں ہیں یا ان کو درج نہیں کرتا کہ ان چیزوں کا تعلق کسی دوسرے علم سے ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی حالتوں میں شرح کرنے والے کو امر محذوف اور اس کے مراتب کے بیان کی حاجت پیش آتی ہے۔

سوم :۔ تیسری بات یہ ہے کہ لفظ میں کئی معنوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ مجاز، اشتراک اور دلالت التزام کی صورتوں میں پایا جاتا ہے۔ اور ان صورتوں میں شارح پر لازم ہے۔ کہ وہ مصنّف کی غرض کو بیان کرے اور اسے دوسرے معنوں پر ترجیح دے۔

ان تین باتوں کے علاوہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بشری تصانیف میں وہ باتیں بھی واقع ہو جاتی ہیں۔ جن سے کوئی بشر خالی نہیں۔ مثلاً تسامح، تکرار اور اسی نوع کے دیگر نقائص۔ لہٰذا شارح کو ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ مصنف کی ان لغزشوں کا بھی اظہار کر دے۔

اب جب یہ بات ٹھیک قرار پاگئی، تو اب ہم کہتے ہیں کہ قرآن حکیم کا نزول محض عربی زبان میں ہوا اور عربی بھی کس دور کی۔؟ افصح العرب کے زمانے کی زبان! پھر ان لوگوں کو بھی قرآن کے ظاہر امور اور احکام ہی کا علم ہوتا تھا۔ لیکن اس کے اندرونی مفہوم کی باریکیاں ان پر اسی وقت منکشف ہوتی تھیں جب وہ بحث و تمحیص سے کام لیتے یا غور و خوض کرتے تھے۔ اور اکثر باتوں کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً جس وقت خداوند اقدس کا یہ ارشاد گرامی نازل ہوا۔ وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ۔ نازل ہوا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا۔ ہم میں سے کون ایسا ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہیں کیا۔ (یعنی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔) اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ کریمہ کے لفظ "ظلم" کی تفسیر "شرک" کے ساتھ فرمائی اور اسی پر دوسری آیت: "إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ" کو بطور دلیل کے پیش کیا۔ یا جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے "حِسَابًا يَسِيرًا" کی بابت سوال کیا تھا کہ وہ کیا ہے۔؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ "عرض" (یعنی اعمال کا صرف پیش کرنا) ہے۔ اور جیسے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا قصہ "الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ" کے متعلق ہوا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی دوسری باتیں ہیں۔ جنہیں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک ایک کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا تھا۔

اور ہم لوگ بھی ان باتوں کے محتاج ہیں، جن کے محتاج حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ علاوہ ازیں ہمیں احکام ظواہر میں سے بھی ایسے امور کے علم کی احتیاج ان حضرات رضی اللہ عنہم کو ہرگز نہ تھی اور ہماری اس احتیاج کا سبب ہمارا بغیر سیکھے ہوئے احکام لغت کے مدارک (فہم) سے قاصر ہونا ہے۔ لہٰذا ہم کو تمام لوگوں سے بڑھ کر تفسیر کی ضرورت اور حاجت ہے۔

اور یہ بات بھی محتاج بیان نہیں کہ قرآن شریف کے بعض حصہ کی تفسیر صرف وجیز الفاظ کی شرح کرنے اور یہ بات ان کے معنی کو منکشف کر دینے سے ہو جاتی ہے۔ اور بعض مقامات کی تفسیر چند احتمالات میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے ہوتی ہے۔ (بحوالہ الاتقان۔ نوع ۷۸)

۲۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تمام اشخاص یکساں فہم و فراست، تفکر و تدبر اور صلاحیت و قابلیت کے نہیں ہوتے۔ کوئی کچھ فہم ہے تو کوئی زود فہم اور کوئی ذکی ہے ——— تو کوئی بالکل غبی۔

اس وجہ سے کسی بات یا کلام کو سمجھنے میں ہر ایک یکساں نہیں ہوتا۔ پھر عام لوگوں کا کلام تو الگ رہا جب معاملہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا ہو جسکی جامعیت، بسط، ہمہ گیری اور وسعت کا کچھ ٹھکانہ نہیں جس میں بیشمار مطالب، فصاحت و بلاغت، اوصاف کلام اور معنی و بدیع کا ایک چمن کھلا ہوا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایسے کلام کی تشریح و تفسیر ایک ضروری چیز ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔

۳۔ پھر قرآن ایک پہلو سے اصول و کلیات کی کتاب ہے۔ جس میں جزئیات نگاری سے کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ ہی اس میں فروعی باتوں کو کھپانے کا اہتمام کیا گیا ہے ——— ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان اصول و کلیات کی تشریح اور جزئیات و تفصیلات کی تبیین و تفسیر ضروری ہو جاتی ہے۔ پھر قوانین و احکام کی تفصیلی صورت، حدود و قیود اور ان کا اطلاق واضح طور پر متعین ہونا چاہئے۔ اور اس ضرورت کو تفسیر پورا کرتی ہے۔

الغرض، مندرجہ بالا عقلی اور نقلی دلائل کی روشنی میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچتا ہے کہ قرآن حکیم کی تفسیر کس قدر ضروری ہے۔ اس کے ذریعے ہی ہمیں اس کتاب مقدس کا فہم حاصل ہوگا۔ جس میں ہماری دنیوی و اخروی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔

ہماری مصنوعات
★ ڈی۔ ڈی۔ ٹی
★ ہائیڈرو کلورک ایسڈ
★ پیرا ڈائی کلورو بنزین
ملک کی مصنوعات کی سرپرستی کیجئے
منجانب :- ڈی۔ ڈی۔ ٹی فیکٹری
نوشہرہ

جدید زبانوں کے عربی مآخذ

محترم جناب مظفر عباسی — (مری)

(۲)

لفظ ایک زبان سے ہجرت کر کے دوسری زبان میں جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ اور اسکی صورت کس طرح مسخ کی جاتی ہے؟ اس کا اندازہ عربی کے لفظ "امیر" سے کیا جا سکتا ہے۔

امیر | امیر عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں صاحب امر یعنی حاکم، انچارج، نگران وغیرہ چونکہ صاحب امر یعنی حاکم مال و دولت کا مالک بھی ہوتا ہے۔ اس نسبت سے اردو میں امیر مالدار کے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا۔ یعنی اردو والوں نے لفظ کے مفہوم میں تبدیلی یا تخصیص تو کی ہے۔ اسکی صورت مسخ نہیں کی۔ البتہ اہل یورپ نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

مسلمان یورپ میں سپین کے راستے گئے تھے۔ اور سپین فتح کرنے کیلئے مسلمانوں نے بحیرہ روم کو عبور کیا تھا۔ گویا مسلمانوں کی بحری فوج نے سپین فتح کیا۔ اور اسی فوج کے مجاہد فرانس پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان مجاہدوں کا سپہ سالار بحری فوج کا کمانڈر "امیر البحر" کہلاتا تھا۔ فرانسیسیوں نے "امیر البحر" کی اصطلاح اپنائی اور اس سے "بحر" حذف کر دیا۔ "بحر" کا لفظ حذف کرنے کے بعد انہیں صرف امیر کا لفظ اپنانا چاہیئے تھا۔ لیکن عربی زبان سے واقف نہ ہونے کے سبب انہوں نے "بحر" کے شروع میں واقع "ال" امیر کے ساتھ جوڑ کر "امیرال" بنالیا اور اس طرح فرانسیسی زبان میں بحری فوج کے نگران کو AMIRAL (امیرال) کہا جانے لگا۔ فرانسیسیوں سے انگریزوں نے یہ لفظ اپنایا۔ تو انہوں نے شروع شروع میں صرف اہل فرانس کی نقل پر اکتفا کیا اور AMIRAL (امیرال) ہی بولتے اور لکھتے رہے۔ چنانچہ پرانی انگریزی میں یہی لفظ ملتا ہے۔ بعد میں اسکی صورت مسخ کر کے اسے ADMIRAL (ایڈمرال) بنا دیا اور آج کل بحری فوج کے

نگران یا صاحب امر کے لئے ADMIRAL (ایڈمیرال) مستعمل ہے۔

غور فرمایا آپ نے کہ فرانس والوں نے لفظ کی صورت اس طرح بدلی کہ "بحر" کے شروع میں کلمہ تعریف یعنی "ال" واقع تھا اسے اپنی ناسمجھی کے باعث "امیر" کے آخر میں جوڑ دیا۔ اور "امیر" کو "امیرال" بنا ڈالا۔ اور فرانس والوں سے انگلینڈ والوں نے جب یہ کلمہ مستعار لیا۔ تو اس میں "ایڈ" کا اضافہ کر کے ایڈمیرال (ADMIRAL) بنا دیا۔

معنوی اعتبار سے بھی تحریف کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ "امیرال" یا "ایڈمیرال" ہر قسم کے نگران، سردار، یا صاحب امر کے لئے نہیں بلکہ صرف بحری فوج کے نگران اعلیٰ کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ حالانکہ جب لفظ بحر حذف کر دیا تھا۔ تو اس لفظ کی عمومیت باقی رہنی چاہیئے تھی۔ اور نہ صرف فوج بلکہ ہر شعبہ کے نگران کو "امیر" یا "ایڈمیرال" کہنا چاہیئے تھا۔

جبل الطارق | سپین، امیر البحر، اور مسلمانوں کی بحری فوج کے ذکر سے ایک اور لفظ یاد آیا جسکی اہل یورپ نے صورت مسخ کر کے ایک مثال اور نمونہ فراہم کیا ہے۔ یہ ہے "جبل الطارق" پرانے اندلس اور موجودہ سپین کے جنوبی ساحل پہ ایک شہر آباد ہے۔ جس کا نام GIBRALTAR (جبرالٹر) ہے۔ یہ عربی لفظ "جبل" اور "طارق" کا مرکب ہے۔ یعنی طارق کا پہاڑ۔ یہ وہ پہاڑی مقام ہے جہاں طارق بن زیاد کی سرکردگی میں مسلمانوں کی بحری فوج نے سرزمین اندلس میں پہلی چھاؤنی لگائی تھی۔

اہل یورپ نے "جبل الطارق" کی صورت مسخ کر کے اسے GIBRALTAR (جبرالٹر) بنا لیا ہے۔ یہ لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ لفظ عربی کے جبل الطارق سے لیا ہے۔ لیکن کسی قاعدے قانون کی نشاندہی نہیں کر سکتے جس کے مطابق "جبل" کو "جبرال" اور "طارق" کو "ٹر" بنا لیا ہے۔

غالباً "امیر البحر" کی طرح "جبل الطارق" میں "الطارق" سے "ال" جبل کے ساتھ لگا لیا گیا ہے۔ اور جبل کے "ل" کو "ر" سے بدل ڈالا ہے۔ اس طرح جبل "جبرال" بن گیا۔ باقی رہا "طارق" سو اس کا "ق" حذف کر کے "طار" باقی رکھا۔ جو تلفظ میں TAR یعنی ٹار اور پھر ٹر بن گیا۔

"ل" اور "ر" (L اور R) کا آپس میں ایک دوسرے سے بدل جانے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ خود عربی میں "سیر" اور "سیل" دو لفظ ہیں جن میں "ر" اور "ل" کا فرق ہے۔ اور معنی کم و بیش ایک ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں "سیر" کا اسم فاعل "سیلانی" مستعمل ہے۔ اگر "ر" اور "ل" آپس میں نہ بدلتے تو یا "سیر" کا اسم فاعل "سیرانی" ہوتا یا سیلانی کا مادہ "سیل" ہوتا۔

حشیش | حشیش عربی میں بھنگ کو کہتے ہیں۔ بھنگ نشہ آور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ

قاتلوں کی ایک جماعت تھی جس کے افراد حشیش یعنی بھنگ پی کر قتل و غارت کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کو "حشیشی" یعنی "بھنگ والے" کہا جاتا تھا۔

صلیبی جنگوں میں اہل یورپ نے مسلمان مجاہدوں کو بے جگری اور بہادری سے لڑتے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ لوگ بھنگ پی کر لڑ رہے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہر اس شخص کے بارے میں حشیش کا لفظ استعمال کیا جانے لگا جو قتل و غارت کا مظاہرہ کرتا۔ پھر یہ لفظ قتل کے معنوں میں اہل یورپ نے اپنایا۔ اور حشیشین "جو حشیش سے جمع تھا، واحد فرض کر لیا۔ اور اسکی صورت ASSASSIN (اساسین) بن گئی۔ اب اہل یورپ نے اپنی زبان میں مزاج کے مطابق اس میں رد و بدل کر کے اس سے حسب ذیل کلمات بنا لئے

ASSASSIN (اساسین) قاتل

ASSASSINATION (اساسی نیشن) قتل

ASSASSINATE (اساسی نیٹ) قتل کرنا

ASSASSINATED (اساسی نیٹڈ) مقتول

ASSASSINATOR (اساسی نیٹر) قاتل

حشیش سے ایک اور لفظ یاد آیا جسے اہل یورپ نے بگاڑا ہے۔ اور وہ ہے۔ "شرقیین" جو "شرقی" کی جمع ہے۔

شرقیین شرقیین عربی لفظ ہے۔ جو مشرق کیطرف منسوب ہے۔ اور جمع ہے۔ جن ممالک میں اسلام کی پہلے پہل اشاعت ہوئی اور جن ملکوں سے مسلمان مجاہدوں نے شروع شروع میں علم جہاد بلند کیا تھا۔ وہ سب ملک براعظم یورپ کے مشرق میں واقع ہیں۔ اس نسبت سے یورپ والوں نے مسلمانوں کو مشرقی لوگ کہنا شروع کر دیا۔

"مشرقی لوگ" ایک اصطلاح بن گئی تھی جس کیلئے عربی میں لفظ مشتق تھا۔ یونانیوں نے سب سے پہلے شرقیین کی اصطلاح استعمال کی اور مسلمانوں کو SARACENOS (سارا کی نوس) کہنے لگے غالباً یونانیوں نے یہ لفظ "شرقیون" سے لیا تھا۔ جو "شرقیین" ہی کی ایک صورت ہے۔ یونانی زبان سے یہ لفظ لاطینی زبان میں گیا تو اسکی املا SARACENUS (سارا کی نوس) ہوگئی۔ گویا یونانی لفظ میں K (ک) تھا۔ اور لاطینی میں C (ک) ہوگیا۔ یہ صرف املا کی تبدیلی تھی۔

تلفظ میں فرق نہ تھا۔ اس لئے کہ لاطینی میں C (ک) کی آواز دیتا ہے۔ لاطینی سے یہ لفظ